مولانا عبدالماجد دریابادی کے تین سوانحی شاہکار

عبدالعلیم قدوائی

زاہدہ منزل 4/873، نیوفرینڈس کالونی، علی گڑھ

برِّاعظم صغیر میں اردو ادب کی جو عظیم خدمات مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲ء—۱۹۷۷ء) نے انجام دی ہیں، وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں۔ اردو نثر میں چند ہی صاحبان اسلوب Stylist ہوئے ہیں۔ جس میں شبلی، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، حسن نظامی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا دریابادی اپنے ہم عصر نثر نگاروں میں ایک منفرد اور ممتاز پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں فصاحت وبلاغت، سلاست اور شگفتگی کے ساتھ جذبات اور فکر وخیال میں توانائی، تنوع اور حکمت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ ایجاز واختصار، برجستہ اشعار ومصرعوں کا استعمال، صنائع و بدائع خصوصاً رعایت لفظی کے سلیقہ وشگفتگی کے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ یہ خصوصیات ان کے سوانحی شاہکاروں حکیم الامت: نقوش وتاثرات، محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق اور آپ بیتی (ان کی خودنوشت سوانح) میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، جن کا تجزیہ اس مختصر مضمون میں پیش کیا جارہا ہے۔

حکیم الامت میں انھوں نے اپنے محترم روحانی مرشد اور شیخ وقت حضرت مولانا اشرف علیؒ سے ۱۵۔۱۶ سال کے گہرے نیازمندانہ تعلقات اور لمبے سابقہ کی بنیاد پر اپنے ذاتی نقوش وتاثرات بڑی خوبی اور دلآویز اسلوب میں پیش کیے ہیں۔ یہ کتاب دوسری سوانحی کتابوں سے بالکل مختلف اور منفرد ہے، مگر دلچسپی اور دل آویزی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ دیباچہ میں مولانا نے خود اس کا بڑا صحیح تعارف یوں کرایا ہے: ''اگر کسی صاحب نے کتاب کو اس شوق میں کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبۂ معرفت وولایت کی تفصیل ہوگی یا اس کے صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی ومدارج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ وہ آگے اس کی ورق گردانی کی زحمت ہی گوارہ نہ فرمائیں۔'' آگے چل کر اس کی مزید تشریح کس دلچسپ انداز میں فرماتے ہیں: ''حضرت شیخ کے کمالات و فضائل اپنی جگہ پر۔ بہرحال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اس صدی میں ہوئے ہیں، ان کی عمر کے آخری ۱۵۔۱۶ سال کے زمانہ میں اس نامہ سیاہ کو ان سے اپنی بساط کے مطابق گہرا نیاز حاصل رہا اور اپنے لمبے تجربہ اور سابقہ میں انھیں ایک بہترین انسان پایا۔ بس اسی زندگی کا ہلکا عکس ان نقوش وتاثرات کے اندر بند کرنے کی الٹی سیدھی کوشش یہاں آپ کو ملے گی۔''

مولانا اشرف علیؒ بیسویں صدی کے ایک ممتاز عالم دین، مفسّر قرآن، فقیہ ومحدث اور شیخ طریقت تھے۔ ایسی ہمہ گیر شخصیت کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنا اور ان سے انصاف کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ مولانا دریابادی نے بڑی خوبی سے اس منزل کو سر کیا ہے اور پندرہ سولہ سال کے تعلقات، واقعات، مشاہدات، علمی، فقہی، کلامی سیاسی، ادبی، اخلاقی اور ذاتی مسائل پر اپنے اور ان کے خیالات، ارشادات اور مشوروں کی تفصیل بڑے دل آویز انداز میں پیش کی ہے۔ عقیدت اور محبت کے باوجود اس کتاب میں مرشد اور مسترشد کا تعلق کہیں سے روایتی تقلید یا اتباع کامل کا نہیں نظر آتا۔ چنانچہ خود انھوں نے اپنے موقف کو بڑی صفائی سے یوں بیان کیا ہے:

''کسی بزرگ کو معظم ماننے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اس کی ساری ہی باتیں دل میں اُتر جائیں اور اس کا ایک ایک جزئیہ واجب التسلیم ہوجائے۔ کم ازکم اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ اطاعت مطلق وغیر مشروط صرف رسول معصومؐ ہی کا حق خصوصی ہے۔''

چنانچہ انھوں نے بعض تفسیری، فقہی، سیاسی، ادبی مسائل اور چند شخصیات کے معاملہ میں حضرت تھانویؒ سے کھل کر اختلاف بھی کیا، جس کی رعایت واجازت انھوں نے فراخ دلی سے دی۔

اس کتاب میں مولانا تھانویؒ کے ذاتی حالات ومشاغل، حکیمانہ نکات، فقیہانہ بصیرت، بالغ النظر آگاہی اور نفسیاتی دقیقہ رسی کو سچائی کے ساتھ ایک سحر انگیز اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ ایک طرف تو وہ مولانا تھانویؒ کی سوانح ہے اور دوسری طرف خود لکھنے والے کی بھی۔ اگرچہ یہ کتاب باضابطہ سوانح نگاری کے اصولوں

سے مختلف انداز پر لکھی گئی، لیکن اپنے منفرد اسلوب، شگفتگی اور دلآویزی کی بنا پر اردو ادب کی مؤثر اور اعلیٰ پایہ کی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

اپنے تجربوں اور مشاہدات کی بنا پر مولانا دریابادیؒ نے اپنے محبوب رہنما کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے.... ''یہی کہنا پڑتا ہے کہ عالم و فاضل، ذاکر و شاغل، عابد اور زاہد درویش بزرگ ہونا اور چیز ہے اور حکیم و مصلح ہونا کچھ اور:

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

کہیں میں عقیدۂ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہہ ڈالتا کہ امام غزالیؒ دنیا میں دوبارہ تشریف لے آئے ہیں۔

حکیم الامت کے متعدد ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ حال میں ایک دیدہ زیب ایڈیشن دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ محاکات نگاری، رقت آفرینی اور سلاست اور روانی میں مولانا کو ید طولیٰ حاصل تھا، جس کی مثال کے لیے دو تین مختصر اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

مولانا تھانویؒ سے پہلی ملاقات کا ذکر یوں بیان کرتے ہیں: ''مہینہ یہی جولائی کا تھا۔ ہائے یہی مہینہ جس نے پندرہ سال بعد دل و جگر کر ڈالا (مولانا تھانوی کی وفات جولائی ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی) اور شروع بلکہ بالکل شروع کی کوئی تاریخ عجب نہیں کہ تین جولائی کی شب ہو کہ سہارنپور شاہدرہ ریلوے لائن کے قدیم اسٹیشن تھانہ بھون پر تین مسافروں کا ایک مختصر قافلہ اُترا۔ سالار قافلہ دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ اور باقی دو میں ایک مولانا عبدالباری ندوی اور دوسرا یہ نامہ سیاہ.... دعا مانگ کر جوں ہی حضرت (تھانویؒ) اُٹھے ہیں کہ نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی۔ ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے۔ یہ نرم بشاش چہرہ، یہ ہنستا مسکراتا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے؟ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اِن سے اور اُن کے بے لطفی ہے، ناچاقی ہے۔ کانوں نے بے شک یہی سنا تھا، لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں دو دوست گلے مل رہے ہیں۔ اشفاق و الطاف کی تفصیل اب کہاں یاد بار بار فرماتے تھے اچھی طرح بیٹھیے، کھل کر بیٹھیے۔''

مولانا تھانویؒ کے انتقال کے بعد ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے مولانا دریابادی نے تھانہ بھون کا سفر کیا اور اس کی روداد یوں بیان کی: ''پندرہ برس کا خوب جانا پہچانا ہوا پچاسوں بار کا چڑھا اُترا ہوا اسٹیشن آج اجنبی سا تھا۔ مانوس آج نامانوس تھا۔ ہر بار حضرت کا کوئی خادم اسٹیشن پر عزت افزائی کے لیے موجود ہوتا تھا اور ایک آدھ بار تو حضرت نے کرم کی حد کر دی کہ خود بہ نفس نفیس تشریف لائے! آج یہ سب خواب و خیال تھا۔ اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں اور مزار؟ آہ مزار نہ کوئی بلند گنبد نہ کوئی کلس دار قبہ، نہ چار دیواری، نہ آستانہ، جنگلہ، نہ کٹہرا۔ ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ، وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ۔ نہ شامیانہ نہ چھت، صرف ایک نیچی سی کچّی تربت، سادگی کی تصویر صاحب قبر کی بے نفسی کا آئینہ۔ نہ لوح نہ کتبہ نہ پھول نہ چادر۔''

ایک نقاد نے بجا طور پر اس کتاب کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ باد آفرینی کے زندہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔

دوسری سوانح مولانا دریابادیؒ نے اپنے محبوب اور بے تکلف دوست مولانا محمد علی جوہرؔ کی دلی محبت و شگفتگی سے محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق کے نام سے لکھی جو سوانحی ادب کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے جس کے پڑھنے سے محمد علی جیسے بطل حریت کی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مولانا دریابادی کے تعلقات زمانۂ طالب علمی سے شروع ہوئے جب محمد علی آکسن ایڈیٹر کامریڈ مسلمانوں کے مسلمہ اور مخلص لیڈر بن چکے تھے۔ جو برابر بڑھتے رہے۔ وہ ان کی ذہانت، انگریزی انشا پردازی اور اخلاق سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ مولانا نے اپنی زندگی میں متعدد شخصیتوں سے اثر قبول کیا جس میں شبلی، اکبرالٰہ بادی، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ شامل تھے، لیکن سب سے زیادہ پائیدار اثرات ان پر محمد علی نے ڈالے۔ چنانچہ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے۔ ''عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی جس زور و قوت، جوش و ولولہ سے حضرت حکیم الامت (اشرف علی تھانوی) سے ہوئی وہ اور کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ ہوئی، لیکن عقیدت سے ہٹ کر ایک شے محبت بھی ہوتی ہے۔ یہ محبت اسی جوش و قوت کے ساتھ محمد علی سے تھی، گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب۔''

مولانا محمد علی سے بے تکلفی کے ساتھ محبت، شدید جذباتی، فکری تعلق برابر بڑھتا رہا۔ چنانچہ باوجود اپنی عزلت نشینی کے انھوں نے تحریک خلافت میں چند سال سیاست میں بھی حصّہ ان ہی کی وجہ سے لیا۔ وہ ان کی بے مثل سچائی، بے باکی، حمیت دینی، اسلام سے محبت اور خطابت کے بڑے قائل تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جب مولانا محمد علیؒ کا انگلستان میں انتقال ہوا تو ان کو بڑا صدمہ ہوا۔ انھوں نے اپنے تاثرات اپنے ہفتہ وار سچ میں

شائع کیے اور پھر خود محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق کے عنوان سے دو جلدوں میں ان کے متعلق ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھ ڈالی جس کا شمار اپنی ادبی لطافت اور دل آویزی کی وجہ سے اردو کے ادب العالیہ میں کیا جاتا ہے۔

محمد علیؒ کی سیرت و کردار کے متعلق اس کتاب میں مستند اور معتبر معلومات ملتی ہیں کیوں کہ مولانا دریابادیؒ ان سے بے انتہا قریب اور محرم اسرار تھے۔ وہ ان پر بے انتہا اعتماد فرماتے تھے اور ان سے بڑی محبت کرتے تھے، جس کا ثبوت ان کے خطوط سے ملتا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے معاملات میں ان سے صلاح مشورہ کیا ہے اور اپنے اخبار ہمدرد کے سلسلہ میں اعانت وتعاون کی بار بار استدعا کی ہے۔ گو یہ کتاب سوانح نگاری کے روایتی اصولوں کے مطابق نہیں ہے، لیکن اس کے مطالعے سے محمد علی کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر پڑھنے والوں کے سامنے آجاتی ہے اور ان کی زندگی کے نشیب وفراز کا مفصل حال معلوم ہوتا ہے۔ اس میں محمد علی کی شخصیت کی خصوصیات، مذہب اور سیاست میں ان کا انداز فکر اور طرز عمل گاندھی جی سے ان کے تعلقات اور ان کے محرکات میں ان کا حصّہ، تحریک خلافت کی رہنمائی، کانگریس اور اس کے لیڈران سے ان کے تعلقات، علی گڑھ کی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس میں ان کی خدمات، گول میز کانفرنس میں شرکت، ولایت کے سفر کی سرگزشت، تبلیغ اسلام کی دھن، ان کی قرآن فہمی، صحافت، انگریزی اور اردو کی انشا پردازی میں ان کا مقام غرض یہ کہ ان کی پوری زندگی کا پورا نقشہ ایسے شگفتہ اور منفرد اسلوب میں کھینچا گیا ہے کہ کتاب کو بیچ میں بند کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مولانا نے اس کتاب میں اپنے محبوب رفیق کی بے لاگ سوانح پیش کی جس میں ان کے افکار و خیالات، سیاسی و مذہبی رزم آرائیوں، ملّی و ملکی خدمات کا ذکر بڑی خوبی، تاثر اور دیانت داری سے کیا ہے۔ ایک طرف ذکر محمد علی کی صدق گفتاری، بے باکی، بلوغت ذہنی، حمیت دینی، حاضر جوابی کا ہوتا ہے اور دوسری طرف ان کی جذباتیت، اصولی مخالفت میں کسی قسم کی مفاہمت، مداہنت کی لچک کے فقدان اور عدم انبساط اور صحت کی طرف سے بے توجہی کا بھی ذکر صفائی سے کیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے محمد علی کے کردار کی بالکل سچی تصویر اپنے مخصوص البیلے انداز میں یوں کھینچی ہے:

''اس کا کلام سن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کر ہنسے، اس کا پیام سن کر مسجد کے محراب و منبر بلبلا کر روئے، خانقاہیں، مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر، ویرانے، قوم پروروں کی کانگریس، پریس، دیوبند، ندوہ، علی گڑھ، فرنگی محل جمعیۃ علماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشاں، سب کا ذرّہ ذرّہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز۔''

مولانا دریابادی کے تعلقات مولانا محمد علی جوہر سے ۱۹۱۲ء سے ان کے انتقال ۱۹۳۱ء تک رہے۔ محمد علی ذاتی ڈائری اسی محبوب کی اٹھارہ سال کی یادوں پر مشتمل ہے۔ محبت کے اس نازک رشتے کو بخوبی قائم رکھتے ہوئے انھوں نے ان اوراق میں محمد علی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن ان کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک اور مؤثر اقتباس ملاحظہ ہو:

''صحابیوں کے سرتاج عمر فاروقؓ سے متعلق جب حدیث نبویؐ میں یہ مضمون نظر سے گزرا تھا کہ عمرؓ کی حق گوئی نے ان کا کوئی دوست باقی نہ رکھا تو دل پر بڑا اثر پڑا تھا اور حیرت بھی ہوئی تھی۔ قدرت حق نے اس کا ایک ہلکا نمونہ آنکھوں کو دکھا دیا۔ محمد علی اس آفتاب کے سامنے ایک ذرّہ سہی، لیکن بہرحال اس ذرّہ پر اسی آفتاب کا پرتو پڑ رہا تھا، یہ مخالف وہ مخالف، عمر بھر کے دوست، عزیز رفیق مخالف، جو اپنے خاص دست و پا تھے وہ مخالف، اب کارٹون ان کے نکل رہے ہیں ان کی ہجوئیں چھپ رہی ہیں اور مخالفانہ تقریروں اور مضمونوں کی تو حد ہی نہیں، اور یہ ساری پورشیں اس محمد علی پر جس کی بائیں آنکھ تو بالکل ہی جا چکی تھی اور داہنی کے چلے جانے کا خطرہ بروقت۔''

تحریک خلافت جب اپنے شباب پر تھی اس کی ایک دلچسپ تصویر اس طرح کھینچی ہے:

''۱۹۲۲ء کا عام منظر، شام کا وقت ہے، امین آباد کے چوراہے پر صدائے خاتون دو دو پیسہ کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی ہے۔ لڑکے دردانگیز آواز سے گا گا کر پڑھ رہے ہیں۔ اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کی دھن میں، صدہا راہگیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آئی بہتوں کو پکڑ کر جیل خانہ پہنچا دیا۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہو گیا ہے۔ محمد علی جب کانگریس میں آئے تو قوم کی قوم ساتھ میں لے کر آئے۔ محمد علی جب جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہو گئی۔''

۱۹۲۴ء میں جب سقوط خلافت کی خبر آئی اُس وقت محمد علی کے حال زار کا کتنا سچا مرقع اس کتاب میں دیکھئے۔:

''۱۹۲۴ء میں جب محمد علی صدر کانگریس ہو کر سارے ملک کے

سردار منتخب ہوئے۔ یہ سنہ ان کی زندگی میں عام الحزن کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ بڑے سے بڑے صدمے شاید اسی سال کے لیے اُٹھ رہے تھے۔ جوان مدقوق بیٹی نے مارچ میں داغ مفارقت دیا اور چاہنے والے باپ کے آنسو ابھی رواں ہی تھے کہ خبر آئی کہ مصطفیٰ کمال نے ادارہ خلافت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ محمد علی کے دل و دماغ پر گویا بجلی گر پڑی۔ جس خلافت کے تحفظ کی خاطر برسوں سے اپنی جان و مال کی بازی لگائے ہوئے تھے، جس کی خاطر جیل کی سختیاں اُٹھائیں، بے گھر بے در رہے اس کا انجام دشمنوں کے ہاتھوں نہیں ایک ترک مسلمان کی جنبش قلم سے دیکھ کر محمد علی پر جو کچھ گزری اسے عالم الغیب ہی جان سکتا ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ دیوانگی کی نوبت کیوں نہ آ گئی۔''

بہر حال محمد علی کو سمجھنے اور ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو جاننے کے لیے یہ سوانحی کاوش نہایت قابل تعریف ہے اور ادبی شگفتگی اور دلچسپی کے لحاظ سے اردو کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا کی آخری تصنیف ان کی لکھی ہوئی آپ بیتی ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی جس میں انھوں نے خودنوشت سوانح کے تقاضے بڑی خوبی سے پورے کئے ہیں۔ ارباب نظر کو بخوبی علم ہے کہ اپنی آپ بیتی لکھنا کتنا کٹھن کام ہے۔ انھوں نے اپنے عہد منظر کی تفصیل، اپنے بچپن کے رسم و رواج، عقائد و اعمال، معاشرتی و سیاسی حالات، توہمات اور رجحانات بیان کیے اور پھر اپنے ماحول، آبا و اجداد، والدین، اعزہ، اقربا، تعلیم و تربیت، اسکول اور کالج کی زندگی، مضمون نگاری، تصنیف و تالیف، صحافت، شکیک والحاد، شادی و اولاد، بیعت و ارادت، ملازمت، عادات و معمولات، تجربات زندگی کا نچوڑ وغیرہ جیسے اہم موضوعات سچائی و شگفتگی سے پیش کیے ہیں۔ اس کتاب کے مکالمہ سے ان کی پہلو دار شخصیت کے تقریباً سب ہی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے آخر عمر میں لکھی اور اس پر بار بار نظر ثانی کر کے کاٹ چھانٹ کی۔ اس کے بہترین مقامات وہی ہیں جہاں انھوں نے اپنے عہد کے ماضی کو آواز دی ہے اور گزری ہوئی قدروں کو حسرت اور تأسف کے ساتھ یاد کیا ہے۔ مثلاً چھ سال کی عمر میں انھوں نے فیض آباد سے گورکھپور اپنے گھر والوں کے ساتھ سفر کیا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ''لکڑ منڈی گھاٹ سے سفر اسٹیمر کا تھا۔ دریائے گھاگھرا میں برسات میں اسٹیمر چلا کرتا تھا جو اس سن کے تخیل میں نمونہ جہاز نہیں مثل جہاز تھا۔ تماشہ ریل کے سفر کا کیا کم تھا۔ یہ بحری سفر اپنے عجوبہ پن میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر نکلا۔ پردہ اس وقت شریف خاندانوں کا جزو زندگی تھا۔ چنانچہ گھاٹ پر پالکی اور کہاروں کا اہتمام پہلے سے کر لیا تھا۔ کتاب کے شائع ہونے تک ذہن اس سوال میں الجھیں گے کہ یہ پالکی کیا بلا تھی۔''

اپنی رسم بسم اللہ کی تقریب کا حال بڑی حسرت اور جذباتیت سے یوں رقم کیا ہے:

''ابھی ابھی فقرہ زبان قلم سے ادا ہوا ہے کہ بوا نے مجھے گود میں اُٹھا لیا۔ فقرہ آج ۱۹۶۷ء میں ۷۴۔۷۵ سال کے پیر سال خوردہ کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ ہائے دایہ کی گود میں جانے کی لذت۔ اب کیا بیان ہو؟ وہ لذّت جس کا بدل نہ کبھی جوانی کی گرمیاں دے سکیں نہ کبھی بڑھاپے کی خنکیاں۔ پڑھنے والے اس مقام پر پہنچ کر ایک پیر نابالغ پر ہنسنے اور مضحکہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ عجب نہیں کہ اس پر پہنچتے پہنچتے انھیں بھی بچپن کی پیاری معصومانہ شرارتوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرع میں:

دو دن کو اے جوانی اُدھار دے دے بچپن

ان کی آپ بیتی میں اسلامی اقدار، شرافت، ماضی کی صالح روایات سے شدید محبت نظر آتی ہے۔ صاف گوئی اور صداقت نگاری اس کا طرۂ امتیاز ہے، انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح کو ۵۱ ابواب میں بانٹا ہے۔ نامور لوگوں اور مشاہیر کے ساتھ چھوٹے اور گمناموں کو بھی یاد رکھا ہے۔ اپنے محسنوں، عزیزوں اور محفلوں کے ساتھ ہی کچھ مرحوم مظلومین جن کے ساتھ انھوں نے زیادتی کی تھی کا معذرت خواہانہ انداز میں ذکر کیا جس کی وجہ سے اس کا مرتبہ اور بلند ہو گیا ہے۔

آپ بیتی کا دیباچہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علیؒ ندوی جو خود بھی بڑے اچھے انشا پرداز تھے، نے لکھا اور اس کی داد بڑی خوبی سے دی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔

ادبی دلآویزی کے ساتھ اس خودنوشت سوانح میں نفسیاتی، اخلاقی اور اصلاحی تعلیمات و معلومات جا بجا ملتی ہیں، جس کو پڑھنے والے خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات پسند فرمائیں گے۔

اردو کے سوانحی ادب میں یہ تینوں کتابیں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے فکر و فرزانگی، حکمت و دانش، سوز و سرور اور جذب و جنوں کی نئی حکایتیں آسانی سے رقم کی جا سکتی ہیں۔

○○